

سائیکہ مضامین

ایمن رضا

سکاش گھر



بچپن کا خلاصہ:

چاند بی بی ایک عمر رسیدہ اور سر سے گنگنی خاتون ہیں۔ ۴۷ء کے ہزارے میں چاند کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے۔ چاند کے ابو دین بابا، بھائی بستم، تین بھوپھیاں، ان کی چھ بیٹیاں اور گھر کا ملازم لڑکا رحبان اس خاندان کو حویلیاں شہر میں ایک ”لکشی حویلی“ الاٹ ہوئی ہے۔ جس کا نام وہ بدل کر ”دین حویلی“ رکھ لیتے ہیں۔ ایک رات چاند کو حویلی کی دہلیز پر ایک بچی نوکری میں پڑی ہوئی ملتی ہے۔ دین بابا کی مخالفت کے باوجود چاند اپنے مگتیرا تنش کی اجازت سے اس بچی کو گود لے لیتی ہے اور اس بچی کا نام صندل رکھتی ہے۔

رحبان یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند کی شادی بہت جلد تنش سے ہونے والی ہے دن بدن چاند کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن وہ چاند سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ چاند رحبان سے کہتی ہے کہ وہ صرف تنش سے محبت کرتی ہے۔ رحبان کے دل میں تنش کے لیے نفرت بڑھنے لگتی ہے۔ بستم کے مشورے پر رحبان، تنش کو قتل کر دیتا ہے اور دین بابا سے چاند کا ہاتھ مانگتا ہے۔ دین بابا کی التجا پر چاند رحبان کے رشتے کو منظور کرتے ہوئے شادی کی رضامندی دے دیتی ہے۔ لیکن پھر کی وجہ سے یہ شادی نہیں ہو پاتی

۱۹۷۲ء۔ اب بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور صندل سمیت گھر کی باقی لڑکیاں بھی جوان ہو چکی



ہیں۔ صندل ان سب میں سب سے زیادہ شرارتی ہے۔ عید گاہ میں انہیں دو خواتین کو صندل کے بارے میں ”نا جائز“ کا لفظ بولتے ہوئے سنتی ہے تو اُسے بہت دکھ ہوتا ہے۔
میرزا داوڑ زیادہ دونوں بہن بھائی ہیں۔ اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے زویا کو جو یلیاں شہر میں اپنے بھائی کے ساتھ آنا پڑا ہے۔ ان کا قیام عارضی ہے۔ اس عارضی قیام میں میرزا کی ملاقات صندل سے ہوئی ہے۔ صندل میرزا کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتی ہے۔ زویا کو دونوں کا ملنا اور بے تکلف ہونا کچھ زیادہ پسند نہیں آتا وہ میر



زاد کی رضا مندی سے میر زاد کی نسبت اپنی نند سے طے کر دیتی ہے۔ میر زاد کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ اب وہ بھی صندل کو جاننے لگا ہے۔
روشن بیگم ”مینا گئی“ کی مشہور طوائف ہے۔ وہ بستی کے خراب معاشی حالات میں اسے مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنی حویلی کی لڑکیوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی دولت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

دسویں قسط

”روشن بیگم کی تو کھانسی میں بھی کھنک تھی۔“ ان کے جانے کے بعد سارا نے تبصرہ کیا تھا۔
”اور نہیں تو کیا“ میں تو ان کی چھینک کے انتشار میں رہی۔ توقع تھی کہ چھینک بھی جلت رنگ ثابت ہوگی۔“ روشن نے ادبی انداز میں گفتگو کرنا چاہی تھی۔
روشن بیگم کے رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے انہی کی طرح بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ روشن بیگم کا تازہ تازہ اثر تھا جو روشن نے اور زارا پر چڑھا ہوا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر تو زارا بھی بیٹھنا چاہتی تھی، لیکن موٹی ہونے کے باعث اس کی ٹانگ بار بار نیچے کو پھسل جاتی تھی۔
”ویسے اس عمر میں اتنا رعب دار ہونا مشکل ہے۔“

”ایک ہماری حویلی کی خواتین ہیں۔“ خیرہ آگاتی ہیں۔“ کرن نے آگے آئے ہال جھکے سے پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔
”شرم کرو لڑکیوں۔“ حویلی کی خواتین کو کس سے ملا رہی ہو۔ روشن بیگم تو باکی ہیں۔ ان کا تو کام ہی بنے ٹھنڈے رہنا ہے۔“ حاجی بوانے سب کو ڈانٹا تھا۔

”اور نہیں تو کیا“ ٹھیک کہہ رہی ہیں حاجی بوا۔ تم بھی کس عورت کا اثر لے رہی ہو۔“ تعبیر نے بڑی اماں بختے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ روشن بیگم کی موجودگی میں اس کی بہت کوشش رہی تھی کہ وہ ان سے میک اپ کے بارے میں پوچھے کہ وہ میک اپ کس کس طریقے سے کرتی ہیں اور چہرے پر کیا کیا لگاتی ہیں۔
”مجھے تو لگتا ہے کہ روشن بیگم صندل سے خاص متاثر ہو کر گئی ہیں۔ وہ تو بار بار اسے ہی دیکھتی جا رہی تھیں۔“ کرن نے حسب عادت صندل سے حید کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کہیں انہوں نے صندل سے رقص نہ کروانا ہو۔“ کہتے ہوئے انشیں کی ہنسی چھوٹی تھی۔
”دور فٹے منہ تھارا انشیں۔۔۔۔۔“ اور حاجی بوا کی بروقت پھینکا پر سب ہی ہنسنے لگی تھیں۔
”ذرا قصور کرو یا۔۔۔۔۔ تم ہنگر دو باندھ کر تاج رہی ہو۔ اور لوگ تم پر پیسوں کی بارش کر رہے ہیں۔“ انشیں کو آج نچانے کیا ہو گیا تھا۔ اس کی ہنسی ہی بند نہیں ہو رہی تھی۔

”خیر سے تمہارا منہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ تو کم از کم بات ہی اچھی کر لیا کرو۔“
”کیا باتیں ہو رہی ہیں۔؟“ بستی می بڑے کمرے کے دروازے پر ظاہر ہوا تھا۔ بستی کو وہاں دیکھ کر سب لڑکیاں ادب کی وجہ سے خاموش ہو گئی تھیں۔

”کچھ نہیں بستی می بابا۔ بس روشن بیگم کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔“ تعبیر نے صاف گوئی سے کہا تھا۔
”کیا باتیں ہو رہی تھیں ان کے بارے میں۔۔۔۔۔؟“

”یہ ہی کہ کافی اچھی خاتون تھیں وہ۔۔۔۔۔“ انشیں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا تھا۔ ویسے وہ جھوٹ بولنے کو کفر کر دج دیا کرتی تھی۔ بے چاری کو آج یہ کفر اس لیے کرنا پڑا کہ کہیں بستی می یہ بابا نہ سمجھ لیں کہ وہ روشن بیگم کو برے لفاظ میں یاد کر رہی تھیں۔

”واقعی ہی بہت اچھی خاتون ہیں وہ۔۔۔۔۔“ بستی نے ساری لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی نظر میں آج ایک عنصر نیا تھا۔ کینٹینی کا عنصر۔۔۔۔۔ وہ ساری لڑکیوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے غار میں بیٹھا بوڑھا شیردلوں کا بھوکا ہوا دروہی نے اس کے غار کے سامنے سات ہرنوں کو لاکر رکھ دیا ہو۔ اور اب بوڑھا شیر سوچ رہا ہو کہ اسے کس ہرنی کو پہلے قلم بنانا ہے۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے اسے روشن بینک کہا بات یاد رہی تھی۔

”تمہاری تینوں چھوٹی بہنوں کی نچھڑکیاں۔۔۔۔۔ چھ بہرے ہیں۔ اور کوہ نور۔۔۔۔۔ تمہاری بہن جاند کی بیٹی۔۔۔۔۔ صندل۔۔۔۔۔“ بستی کی آنکھوں میں الاؤ سا روشن ہونے لگا تھا۔ چھ بہروں کی چمک جیسے اس کی آنکھوں میں گھسی چلی جا رہی تھی۔ اور کوہ نور تو اس کی آنکھیں چند دھیرا ہاتھا۔

”صندل۔۔۔۔۔“

”جی بستی بابا۔۔۔۔۔“

”میرے لیے حقہ بنا دو گی تم۔۔۔۔۔ سلہان کی طبیعت کچھ نا ساز ہے آج۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ میں بنا کر لاتی ہوں۔“ صندل کہتے ہوئے فوراً سے اٹھی تھی۔

”میرے کمرے میں لے آتا۔۔۔۔۔“ بستی نے ایک نظر سب لڑکیوں کو دیکھا تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا۔

”حیرت ہے۔ آج بستی بابا نے اپنا کوئی کام صندل سے کہا ہے۔“ ردشانی نے دونوں کے جانے کے بعد تبصرہ کیا تھا۔

”واقعی۔۔۔۔۔ ورنہ وہ تو صندل کو زیادہ منہ لگانا پسند نہیں کرتے۔۔۔۔۔“

”صندل کے حوالے سے بستی بابا کی اتنی سرد مہری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“ افشیں نے پرسوج انداز میں کہا تھا۔

”صندل کا ناجائز ہونا۔۔۔۔۔“ کرن نے بے اختیار ہی کہہ دیا تھا۔

”سب کزنوں نے اسے گھورا تھا۔ حاجی بوا بھی پیس پر کڑھائی کرنا چھوڑ کر گھوڑتے ہوئے کرن کو دیکھنے لگی تھیں۔ کرن کو احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ عجیب لفظ بول گئی ہے۔

”معافی چاہتی ہوں۔ لیکن میری نظر میں بات یہی ہے۔“ کرن نے فوراً سے معافی مانگ لی تھی۔ سب کزنوں کا اس کی طرف سے دل صاف ہو گیا تھا۔

”لیکن یہ لفظ بھی صندل کے سامنے مت بول دینا تم۔۔۔۔۔“ حاجی بوا نے تنبیہی انداز میں کہا تھا۔ ”صندل کو تو دکھ ہو گا ہی۔۔۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ چاند کو بھی رنج ہو گا۔“

”نہیں کہوں گی۔“ شرمندگی کے مارے کرن کی مدھم سی آواز برآمد ہوئی تھی۔

”چلو، اب سو جاؤ سب۔۔۔۔۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“

حاجی بوا کے کہنے پر سب ہی اٹھی تھیں اور دائیں بائیں بکھرنے لگی تھیں۔ افشیں نے سب کے سامنے کمرے میں جانے کا ڈرامہ کیا تھا۔ اور ایک ستون کی اوٹ میں ہو کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے ابھی جاگنا تھا۔ کیونکہ حویلی سے باہر عادل کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

☆☆☆

اور عقاب میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ یہ پرندہ سکھانے سے بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ اپنے شکار کو بہت دور سے دیکھ لیتا ہے۔ اور اسے خبر ہونے سے پہلے ہی اسے آدبوچتا ہے۔

چونے سے بنے اس ٹھوس عقاب کو دیکھتے ہوئے بستی سوچوں میں گم تھا۔ دو عقاب مد مقابل تھے۔ ایک عقاب بے جان تھا۔ وہ شکار نہیں کر سکتا تھا۔ اور دوسرا شکار کرنے کے لیے داؤچ سیکھ رہا تھا۔ وہ بھی شکار کو خبر ہونے سے پہلے ہی دبوچ لینا چاہتا تھا۔

”یہ لیں بستی بابا۔ آپ کا حقہ تیار کر کے لے آئی ہوں۔“ صندل حقہ لیے وہاں آئی تھی، اور پھر حقے کو اس نے نیپل پر رکھ دیا تھا۔ بے جان عقاب سے نظریں ہٹا کر بستی یا پلٹا تھا اور گہری نظروں سے صندل کو دیکھنے لگا تھا۔ صندل کا لباس آج اس کے وجود پر کچھ تنگ سا تھا۔ چاندنی کو لڑکیوں کے تنگ لباس سخت ناپسند تھے۔ لیکن شاید دھوپ نے گرم کپڑوں کو سردی کی وجہ سے گرم پانی میں دھو دیا تھا جو وہ اسے تنگ ہو گئے تھے۔ اس کے گال جو ہمہ وقت سرخ شیب ہوئے رہتے تھے۔ آج کچھ زیادہ ہی دھبہ رہے تھے۔ وہ جیسے کوئلوں کی دھبہ کو اپنے چہرے پر سجالاتی تھی۔ اس کے سیاہ بال کانوں سے گھٹکھ اٹے ہو کر اس کے چہرے پر دو حفاظتی پہرے داروں کی طرح گھڑے تھے۔ جیسے ڈھونڈ کوئی اس کے چہرے پر گستاخی نہ کر لے۔

”کس کی بیٹی ہے یہ؟“ کہاں سے آئی ہے؟ اس جیسی کوئی عورت اس شہر میں تو کبھی نہیں دیکھی۔ پھر کس کی بیٹی ہے یہ۔ کون اسے ہمارے گھر کی دہلیز پر چھوڑ گیا۔ کوئی ہیرے کو بھی کسی اور کی دہلیز پر چھوڑ کر جاتا ہے کیا۔ نہیں ہیرا نہیں۔ کوہ نور۔“ صندل کو دیکھتے ہوئے بستی سوچنے لگا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں بستی بابا۔“ صندل بستی کے خود کو ایسے دیکھنے سے کچھ جھک سی گئی تھی۔ ”یہ دیکھ رہا ہوں کہ چاند نے تمہاری سنی اچھی تربیت کی ہے.....“ گھاگ بستی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”خوبی کی تمام لڑکیوں سے تم سب سے زیادہ مختلف ہو۔“

بستی کی بات کے جواب میں صندل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب بستی کے منہ سے اتنی اچھی باتیں سننے کا موقع ملا تھا۔

”چاند نے ہی تمہیں حویلی میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تب میں نے اس کے فیصلے کی مخالفت کی تھی۔ آج سوچتا ہوں کہ غلط مخالفت کی....“

بستی کے ذہنی انداز پر صندل نے کچھ سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ ”تم ہی تو اس حویلی کی روتی ہو۔“ عیار سوداگر کی طرح بستی باتیں بناتے لگا تھا۔ اور صندل مسلسل مسکراتے جا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ جا کر سو جاؤ تم.....“ ”شب بخیر۔“ صندل کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ ”تم شب کی بات کرنی ہو صندل۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب سب ہی طرف ”خیر“ ہونے والی ہے۔“ بستی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور حقہ کڑکڑانے لگا تھا۔ ”زندہ مٹی والے ہیروں کی قیمت تو تین لاکھ تھی۔ ان دھڑکتے دل والوں کی کیا قیمت مل سکتی ہے؟“ بستی سوچ بچار کرتے ہوئے جوڑو کرنے لگا تھا۔

”میرے خیال سے یہ ہیرے سمندر کے ہیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ روشن بیگم کی بات ماننے میں کوئی حرج نظر نہیں آ رہا۔“ بستی نے خود سے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ ”رجبانی کے کمرے سے سنکھ کی آواز پوری قوت سے ساری حویلی میں گونجی تھی۔ رات کا وہ پہر بڑا ہی ظالم تھا۔ حقے کے دھوئیں میں شیطان جنم لینے لگے تھے۔“

☆☆☆

ساری رات اسے یا تو نیند نہیں آ سکی تھی یا اس قدر اچھی نیند آئی تھی کہ ابھی تک اس کی آنکھیں نیند کو ہی آغوش میں لیے ہوئے تھیں۔ دن چڑھ آیا تھا۔ اور وہ جاگتا ہوا سو رہا تھا۔ ایسا اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب انسان کا دماغ اُلجھنوں میں گرفتار ہو۔ وہ بھی اُلجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ایک طرف صندل بھی اور ایک طرف

اس کی بہن زویا کی منڈ تانیہ... جس سے شادی کے لیے وہ رضا مندی دے چکا تھا۔ اب اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ صندل سے محبت کرنا چھوڑ دے یا اپنی بہن زویا کو انکار کر دے۔ سالوں کے بعد زویا ماں بننے والی تھی۔ ایسے میں میرزا کی کوئی بھی بات اسے ٹینشن دے کر کسی ٹینشن کا باعث بن سکتی تھی۔ زویا کے معاملے میں وہ کوئی بے احتیاطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”میر... اٹھ جاؤ میر... دن چڑھ آیا ہے باہر۔“ زویا اس کا نام لکارتے ہوئے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ میرا بھی تنگ بیڈ پر اوندھا لیٹا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے پیچھے کر دیے تھے۔ پردے پیچھے ہوتے ہی حویلیاں شہر کی سردی کے ساتھ ہم آغوش ہوتی دھوپ کمرے میں اُترتی تھی۔ یہ دھوپ اونٹ کی کھال سے بے لمب کی طرح کی تھی۔ جس کے چلنے اور بند ہونے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

”اٹھ جاؤ... کیا ہو گیا ہے تمہیں تم اتنا تو بھی نہیں سوئے۔“ زویا نے اسے پشت سے جھنجھوڑا تھا۔ ”جی اٹھ چکا ہوں۔“ کسلندی سے اٹھتے ہوئے اس نے تکیے کے ساتھ پڑی ٹی شرٹ کو اپنے وجود پر چڑھایا تھا اور پھر بیڈ کی پشت سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔

”ابھی میری زدو ہیپ سے بات ہوئی ہے۔“ زویا نے کچھ چپکتے ہوئے بتایا تھا۔ زویا کے خوش گوار انداز پر میرزا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد تمہاری اور تانیہ کی دھوم دھام سے منگنی کریں گے۔ پھر جب تم دونوں چاہوشادی کروں گے۔“ زویا نے سوئے دماغ والے میرزا پر زور دہماکا کیا تھا۔ وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں پایا تھا۔

”ٹھیک ہے ناں۔؟“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس کی آواز بھی ہوئی تھی۔ اس میں نیند کا اثر نہیں تھا۔

”دیکھنا میں تمہاری شادی کس قدر دھوم دھام سے کرنی ہوں، ایک ہی تو بھائی ہو تم میرے۔ میں کسی چیز میں کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔“

میرزا نے کوئی تہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے تھے اور اپنی شادی کی بات پر مسکراہٹ بھی۔

”تم صندل کو بھی بلانا اپنی شادی پر۔“

میرزا نے چونک کر زویا کی طرف دیکھا تھا۔ نجانے کیوں اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے زویا نے اس پر چوٹ کی ہے۔

”بلکہ صندل کی ساری فیملی کو بلائیں گے ہم۔“

”آپ ابھی صندل سے اس بارے میں کوئی بات مت کیجیے گا۔“ وہ بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

”کیوں؟“

”اسے میں اپنی شادی کا سر پر اُزدینا چاہتا ہوں۔“

میرزا نے جھونڈا جواز گھڑا تھا اور پھر واش روم میں چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی زویا کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ اب وہاں ایک منفی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

”تمہیں میں بہت اچھے سے جانتی ہوں میر۔ مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتے ہو تم۔“ اس نے خود سے کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس وقت کرنا ہے۔

☆☆☆

روشن بیگم کے پاس دیس بدیس سے آئے نٹ نے ٹخنوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ جو اس کے چاٹنے والے ایسے گاہے لگا ہے دیتے رہتے تھے۔ دھاتی ظروف، پتھر سے تراشے ہوئے جانور، لکڑی کے آرائشی ٹکڑے، قیمتی

پتھروں سے بچے فحان۔ کتنے کو تو استعمال کرنے کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ دوتھے اس کی نظر میں بے توقیر ہوتے تھے۔ وہ سب کو دل و جان سے سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ خواہ مدتوں کوئی چیز نظروں سے اوجھل ہی کیوں نہ رہی ہو۔ اسے یاد رہتا تھا کہ وہ کب اس کے کونٹے پر آئی تھی اور اسے کون لایا تھا۔ وہ چیزوں کو خاص اہتمام سے استعمال کرنے کی عادی تھی۔ جیسے خالص مردارید کی بیج پر اس نے جب خدا کا نام پکارتا تھا جب اس کے کونٹے کے حالات بہت خراب جارہے تھے۔ سودیہ سے آئی جائے نماز پر اس نے تب شکرانے کے نفل ادا کیے تھے جب اس نے اپنی پہلی بیٹی کو جنم دیا تھا۔

اور آج شیشے کی شطرنج کو اس نے تب نکالا تھا جب وہ بستی کے ساتھ ایک نئی چال چلنا چاہتی تھی۔ ”پھر کیا سزا ہے تم نے بستی؟“ روشن بیگم نے شیشے کی شطرنج پر پیادے کو ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنے سامنے سر جھکائے خاموش بیٹھے بستی سے پوچھا۔

”آپ کی بات مان لینے میں کوئی حرج نظر نہیں آ رہا۔“
”تو پھر مان کیوں نہیں لیتے ہو۔ ہمیں معافی پریشانیوں سے نکالنے کے لیے میں نے بہت مناسب حل بتایا ہے۔“ روشن بیگم شاید اپنے لحاظ سے ٹھیک ہی بات کر رہی تھی۔ وہ بری نہیں تھی۔ اس کی پروش ہی اس طرح سے ہوئی تھی کہ اسے اپنی سوچ سے دوسروں کی زندگی چلانے میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی۔

”کھڑے افراد پر رعب جمانا مشکل نظر آ رہا ہے۔“
”یہ کیا بات کر رہے ہو بستی۔۔۔ مجھے تم سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔“ روشن بیگم نے کہا تو بستی کو خود بخود ہی اسے آپ شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

”آج وہ لوگ جس گھر میں رہ رہے ہیں وہ تمہارا ہے۔ جو کھارہے ہیں وہ بھی تمہارا ہے۔ پھر تمہارا رعب کیسے نہیں چلے گا ان پر۔“ روشن بیگم نے کہا تو بستی کو اپنی حیثیت کا جیسے اندازہ ہوا تھا۔

”کہہ دو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ اس کا سینہ خود بخود ہی تن گیا تھا۔
”پھر میری بات مان لو۔ جیسا میں کہتی ہوں ویسا ہی کرو۔۔۔ دیکھنا۔۔۔ دلوں میں تمہارے حالات بدلتی جائیں گے۔ مالامال ہو جاؤ گے تم۔۔۔ دولت سنبھالنے نہیں سنبھلے گی۔“

”کیا کرنا ہوگا مجھے۔۔۔؟“
”وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔۔۔ میں تمہاری ایک ایک بات پر رہنمائی کروں گی۔ تمہیں اس مشکل گھڑی میں بالکل

تہا نہیں چھوڑوں گی۔“

اور سالوں کے تعلق کے بعد بستی کو روشن بیگم پر اتنا اعتماد تو تھا ہی۔۔۔

”ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کہیں۔“ چند لمحے سوچ لینے کے بعد بستی نے رضامندی دے دی تھی۔ روشن بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

”یہ ہوئی ناں بات۔۔۔“ اس نے ایسے کہا تھا جیسے شطرنج کی بازی بیچ راستے میں ہی جیت گئی ہوں۔ چار ہیروں کا میٹیشن اس نے بستی سے ٹھیک ٹھاک لیا تھا۔ اب تو ساتھ ہیروں کی سودا بازی کی باری تھی۔ ان کا میٹیشن تو روشن بیگم کے کونٹے کو بھی سب میں ممتاز کر سکتا تھا۔

”پلان کیا ہے۔۔۔؟“
”میرے خیال سے پہلا نمبر تمہارے بڑی چھو بھوکی بڑی بیٹی کا ٹھیک رہے گا۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟“

”افشیں۔۔۔“
”ہاں، افشیں، اس کے لیے لاہور کے ایک نواب ہیں میری نظر میں۔۔۔ جاگیروں کے مالک

ہیں۔ سرگودھا میں اپنے باغات ہیں۔ دولت سے تجوریاں بھر دیں گے تمہاری۔“

”کیسے ہوگا سب؟“

”میرے ہوتے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بستی۔ میں تمہیں سمجھاؤں گی کہ کیسے ہوگا سب۔ تم بالکل فکر ہی مت کرو۔“

”آپ ساتھ ہیں تو مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ بستی نے ایک طرح سے ہر طرح کی رضا مندی دے دی تھی۔

☆☆☆

افشین کے دل کو کبیں قرار نہیں آ رہا تھا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے عادل سے ملے ہوئے۔ عادل شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اپنی ماں کے علاج کے لیے۔ جاتے وقت اس نے کا تھا کہ وہ دو تین دن میں ہی واپس آ جائے گا۔ لیکن نجائے کیا بات ہوئی تھی کہ اسے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا لیکن اس کے آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

افشین کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں عادل کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو چکی تھیں۔ رات کے خاموش پہر میں عادل کی آمد کا اشارہ دینے والی اس کی بالاسری کی آواز کو سننے کو اس کے کان ترس چکے تھے۔ ان دنوں میں اس نے عادل کے لیے بہت سے خط لکھ لیے تھے۔ وہ غسل خانے میں چھپ کر دروازے کے اندر سے اسے عادل کے لیے خط لکھا کرتی تھی۔ ان خطوں کا لب و لہجہ زیادہ کچھ نہیں تھا ماسوائے اس کے کہ وہ اس کو کتنا یاد کر رہی ہے۔ اور اس کے بنایہ دن کیسی اذیت میں گزار رہی ہے۔

وہ پہروں چھت رہتی تھی یا جھروکے میں بیٹھی رہتی تھی۔ ان دنوں اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ تہمنہ چھو چھو کو اس کے بدلے مزاج پر شک ہوا تھا، لیکن پھر انہوں نے خود ہی اسے افشین کی ذہنی عمر میں سنجیدگی کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ باقی کر زمان دنوں بازاروں میں گئی تھیں اور وہ ہنس بول بھی رہی تھیں۔ سر دیوں کے کھیل کھیل رہی تھیں۔ لیکن وہ نہ تو ان کے ساتھ گھر سے باہر نکلتی تھی اور نہ ہی ان کے ہنسی مذاق یا کسی کھیل میں شریک ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ صندل کے توسط سے سب کو ہٹا چلا گیا تھا کہ محترمہ عشق کی آگ میں جل رہی ہیں۔

سب نے افشین کے گرد گھیرا گھٹ کیا تھا۔ اس پر سوالوں کی بارش کر دی تھی۔ لیکن عادل کی غیر موجودگی کو افشین نے کچھ اس طرح دل پر لگایا ہوا تھا کہ وہ ان کے کسی سوال کا ٹھیک سے جواب نہیں دے پاتی تھی۔ نجائے کیوں ایک دوسرے سے جگ کر رہا تھا کہ اب وہ بھی عادل کو نہیں دیکھ پائے گی۔ اسی دوسرے کے تحت اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین عارت ہو چکا تھا۔

”افشین... یہاں کیا کر رہی ہو؟“

بستی نجائے کب وہاں چلا آ رہا تھا۔ اس نے جھروکے میں خاموش بیٹھی افشین کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ویسے ہی۔“ کرنے کو کوئی کام نہیں تھا تو یہاں آ کر بیٹھ گئی۔“

”کرنے کو کوئی کام کیوں نہیں تھا۔“ افشین کے قریب ہوتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

افشین آگے سے مسکرا دی تھی۔

”ویسے اب تمہاری بیاہی کی عمر ہو چکی ہے۔ میرے خیال سے تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔“ مسکراتے ہوئے بستی نے کہا تھا۔ افشین کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔ اس سے کچھ بھی بولا نہیں گیا تھا۔ بستی نے چند لمحوں سے گھورتا رہا تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے سنیا رسونے کی پرکھ کرتے ہوئے اس کی قیمت کا تعین کرتا ہے۔ بستی بھی تعین کر رہا تھا کہ یہ ”مال“ کتنی بابت کا ہے۔ اسے کتنا امیر کر سکتا ہے۔ روشن بیگم نے کہا تو تھا کہ افشین کی بہت اچھی قیمت مل سکتی ہے۔ اب دیکھنا تھا کہ روشن بیگم کی بات جی ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔۔۔

”اپنی امی کو میرے پاس بھیجو ذرا۔۔۔“

”جی بہتر۔“ انہیں کہہ کر فوراً ہی سے اپنی ماں کو بلانے ان کی کمرے کی طرف گئی تھی۔ بستی میں
مونچوں کو تا دیا تھا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔
☆☆☆

”ہاں بستی۔ تم نے بلایا۔؟“
”جی چھو چھو بیٹھے میرے سامنے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ بستی نے اتنے ادب سے کہا تھا کہ
تہینہ چھو چھو تو لمحے بھر کے لیے حیران ہی رہ گئی تھی۔ حیرت چھپاتے ہوئے وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔
”انشیں اب بڑی ہو چکی ہے۔ اس کے پیادہ کو لے کر کیا سوچا ہے آپ نے؟“
”میں تو خود بہت مگر مند ہوں بستی۔ ایک دور شے کروانے والیوں سے کہا ہوا ہے۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔“
”میر۔ پاس انہیں کے لیے ایک رشتہ ہے۔ لاہور سے ہے۔ نواب خاندان ہے۔ ہجرت کر کے یہاں
آئے ہیں۔ بہت بڑی کوٹھی ہے لاہور میں ان کی۔ ہماری حویلی توان کی کوٹھی کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ مال
دار اتنے ہیں کہ کیا بتاؤں۔“ بستی نے جو بتایا تھا سب سچ بتایا تھا۔ بس یہ سچ چھپایا تھا کہ نواب انہیں سے
چالیس سال بڑا ہے اور اپنے چھ بچوں کی شادی کر دینے کے بعد نواسیوں اور پوتے پوتیوں والا ہے۔
”اگر وہ اتنے ہی مال دار ہیں جتنا تم بتا رہے ہو تو ہمیں لگتا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے رشتے داری جوڑ لیں گے۔؟“
”وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ منڈی کے توسط سے جانتے ہیں وہ ہمارے گھرانے کو۔ میں نواب
سے مل بھی چکا ہوں۔ ٹھہری ہوئی طبیعت کا مالک ہے۔ ہماری انہیں خوش رہے گی وہاں۔“
”ٹھیک ہے بستی۔ اگر تمہاری لیلی ہے تو بلاو انہیں گھر۔ انہیں کی شادی ایسے گھر میں ہو جائے۔ میں
اس کے علاوہ اور کیا چاہوں گی۔“ تہینہ چھو چھو نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔
”ٹھیک ہے۔ میں آج ہی پیغام بھیجوا دیتا ہوں۔“ بستی نے کہتے ہوئے فوراً سے سلمان کو کمرے میں بلایا تھا۔
تہینہ چھو چھو اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی تھی۔ انہیں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی۔ بھلا بستی
نے کب گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتا شروع کر دی اور وہ بھی خالصاً عموماً کے کاموں میں ...
اندر کمرے میں بستی سامان کو کچھ ہدایات دیتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

اونٹ کے کھال کے لیب والی صبح اس دن کچھ زیادہ ہی بے رس تھی۔ سردیاں جوں جوں قریب آرہی تھیں
دھوپ جیسے حویلیاں شہر سے روٹھتے ہوئے دور جا رہی تھی۔
دہرے لحاف میں لپٹی ہوئی صندل کا سہر بھاری ہو رہا تھا۔ ساری رات اسے ٹھیک سے نیند نہیں آسکی تھی۔
جس قدر مشق اس نے کل شام میں استاد صاحب کے ساتھ مل کر سنا کر کی تھی اسے لگا تھا کہ رات میں سنا کر کی یہ
ہی دھنیں اس کے دماغ میں گونجتی رہیں گی اور اسے سونے نہیں دیں گی۔ لیکن اس کے برعکس اس کے دماغ پر کوئی
اور ہی چیز تھوڑے مارتی رہی تھی۔

”دخال آنے والا ہے۔ کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔“ آواز کے ساتھ ساتھ اس کے خواب میں
وہ بوڑھی باگلی عورت بھی آتی تھی جس سے اس دن اس کی بازار میں مڈ بھیر ہوئی تھی۔
”میں نے کہیں منہ کالا نہیں کیا۔ کالا نہ کیا، منہ کالا کرنا ہے۔“ بوڑھی دہائی دیتے ہوئے جیسے اس کے
سر ہانے بیٹھی چلا رہی تھی۔ کبھی وہ رونے لگتی تھی کبھی ہاتھوں والی ہنسی ہنسنے لگتی تھی۔
یہ اسی سب کا اثر تھا کہ من میں اٹھتے اٹھتے اسے کالی دیر ہو چکی تھی۔ باہر دن نکل آیا تھا۔ اگرچہ بے رس ہی تھی۔
”آج تم نے اٹھنے میں بہت دیر کر دی صندل۔“ چاند اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی اون اور سلاخیوں سے

کچھ بنا رہی تھی۔ ان کی صلاحیاں تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ کافی دنوں سے یہ کام کر رہی تھی۔
مندل جانتی تھی کہ بھتیجا چاند سے کے لیے کچھ بنا رہی ہوگی۔ سردیاں آتے ہی اس کے ایسے کام شروع ہو جاتے تھے۔

”ساری رات کچھ آوازیں مجھے تنگ کرتی رہی ہیں۔“
”کیسی آوازیں...؟“ وہ سلامیاں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
”شاید کوئی پاگل خاتون ہیں۔ عجیب و غریب باتیں کرتی ہیں۔“
”کچھ تو بتاؤ۔“

”دجال آنے والا ہے۔ کالی کوئل کے گھر سفید بچہ پیدا ہوا ہے۔ یہ بچہ میرا ہے۔ وغیرہ وغیرہ...“
”میرے خیال سے تم آمنہ کی بات کر رہی ہو۔“
”آپ جانتی ہے انہیں...؟“ چونکتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”ہاں... جانتی ہوں لیکن زیادہ نہیں۔ وہ اسی شہر کی عورت ہے۔ جوانی میں کچھ ہوا تھا اس کے ساتھ، تب ہی سے اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ زیادہ تر پیدل ہی ہوتی ہے وہ، اور اسی طرح شہر گھر ہوا کرتی ہے۔ میرے خیال سے میں نے چھ سال کے بعد کل رات اس کی آواز سنی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ چھ سال کے بعد اپنے شہر واپس آئی ہے۔“

”کیا ہوا گا اس کے ساتھ چاندی...؟“ مندل نے ہمدردی سے پوچھا تھا۔
”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میں نے ایک دو بار پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آمنہ بہت بے ربط باتیں کرتی تھی۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی اس کی بات... اس لیے کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہوا ہوگا بے چاری کے ساتھ... ہاں اتنا ضرور بتا ہے کہ اس کا جوانی میں ارشادی کے ساتھ بہت گھومنا پھرنا تھا۔“

”ارشادی بابا... جن کی بازار میں دکان ہے؟ جو ماتھے پڑھ کر تقدیر بتاتے ہیں۔“
”مندل اچھل کر بیڈ سے اُتر گئی۔ اس نے جس انداز میں کہا تھا۔ چاند نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
”تم کیسے جانتی ہو کہ وہ ماتھے پڑھتا ہے؟“

”وہ... ان کی دکان کے باہر لکھا ہوا ہے۔“
”دکان کے باہر ہاتھ پڑھوانے کا لکھا ہے۔ ماتھے والی بات وہی جانتے ہیں جو دکان کے اندر جاتے ہیں۔“
”مندل چپ ہوئی تھی۔ چاند سے گھورنے لگی تھی۔
”تم کئی نہیں وہاں؟“

”نہیں... دوست سے سنا تھا۔“ چاند کے غصے کے ڈر کی وجہ سے اس نے صاف جھوٹ بول دیا تھا۔
”جانا بھی مت... مجھے ایسے کام سخت ناپسند ہیں۔ تقدیر کے حوالے سے بس خدا کی ذات پر یقین رکھنا چاہیے۔“

”جی...“ وہ واقعی ہی مین شرمندہ ہوئی تھی۔ ارشادی بابا کے پاس جانے پر تو وہ تب سے خود کو ملامت کر رہی تھی کہ وہ وہاں گئی کیوں...۔

”بعض لوگوں کے ساتھ زندگی کس قدر برا کرتی ہے ناں چاندی...“
”ہاں... بعض لوگوں کے ساتھ زندگی واقعی ہی بہت برا کرتی ہے۔“ چاند نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے انہیں اپنی زندگی کے دکھ یاد آ گئے ہوں۔ دنوں میں چند لمحوں کی خاموشی آئی تھی۔ پھر چاند نے ہاتھ میں نئی چیز اٹھاتے ہوئے اسے دکھائی تھی۔

”لو..... یہ تو بن گیا۔“
صندل نے دیکھا کہ وہ کسی نو مولود بچے کا ادنیٰ لباس تھا۔ جبکہ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ چاند اس کے لیے کچھ بنا

رہی ہے۔
”یہ کس کے لیے ہے۔؟“

”زویا کے ہونے والے بچے کے لیے.....“
”کیا بچہ میں؟“ چپکے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے چاند واقعی ہی میں اسی کے لیے

کچھ بناتی رہی ہے۔
”ہاں..... زویا کی والدہ نہیں ہیں ناں..... تم اسے یہ سب دے آنا، اسے اچھا لگے گا۔ بلکہ میں کچھ دیکھی

چیزیں بھی بنا دوں گی۔ تم وہ بھی دے آنا اسے، وہ خوش ہو جائے گی۔“
”جی..... کیوں نہیں.....؟“

”اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو، میں تمہارے لیے ناشتا بنواتی ہوں۔“ چاند کہتے ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔
صندل اٹھی تھی۔ کمرے سے باہر گئی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو یا تھا اور پھر کپڑے تبدیل کیے تھے۔ اس

سب کے دوران وہ جس قدر بوڑھی آمنہ کی آوازوں کو ذہن سے جھٹلاتی رہی وہ اتنا ہی اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں۔
☆☆☆

حویلی کے دلاؤں میں گرد ویرے ڈال چکی تھی۔ مدتیں گزریں وہاں کسی کے قدم نہیں پڑے تھے۔ بوڑھی چاند بی بی کے جسم میں اتنی سخت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے حصوں کی دیکھ بھال کرے۔ وہاں جھاڑو پونچھا لگائے۔ اس لیے حویلی کے بہت سے حصے اب خندوش حالت میں تھے۔ زنگ والی جگہوں پر مزید زنگ چڑھ چکا تھا۔ دیوبک اور زیادہ راجدھانی قائم کر چکی تھی۔ کھڑکیاں، دروازے اپنی اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار تھے۔ ایک چیز میں بدلاؤ نہیں آیا تھا اور وہ تھی درگا مورنی کی سیاہ آنکھیں..... جو کہ سالوں گزر جانے کے بعد کچھ مزید سیاہ کئے گئی ہیں۔

”دجال آنے والا ہے۔ وہ سب کو مار دے گا۔“ بوڑھی آمنہ حویلی کے ستون سے سر ٹکائے بیڑا رہی تھی۔ سالوں گزرے اس نے چلانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ کسی حد تک یاکل نہیں رہی تھی بلکہ باشعور ہو چکی تھی۔ لیکن کسی کسی وقت اسے ماضی یاد آ جاتا تھا۔ تب وہ ایسے ہی بیڑا ایا کرتی تھی۔

آمنہ کا ماضی بہت سچا تھا۔ اور اس کی شروعات ارشادی سے ہوتی تھی۔ اس کے خوب صورت اور خوش شکل محبوب سے..... جسے وہ پہرہوں دیکھا کرتی تھی۔ تب بڑے شہر سے پڑھ کر آئے ارشادی کے سر پر ہر وقت جادو کا بھوت سوار رہتا تھا۔ اسے لوگوں کے ہاتھ پڑھنے کا علم جانتا تھا۔ اسے لوگوں کے ماتھے پڑھنے تھے۔ غائب کے بارے میں جستجو رہتی تھی اسے۔ کاش وہ ایک بار آمنہ کا ہاتھ بھی پڑھ لیتا۔ تو جان جاتا کہ آمنہ کی زندگی اسی کے کارن کسی دردناک گزرنے والی ہے۔

بوڑھی چاند بی بی نے پیچیر میں روٹی اور سالن کی بوڑھی آمنہ کے سامنے رکھی تھی۔
”کھانا کھالیں۔“

ایک بوڑھی دوسری بوڑھی کو گھورنے لگی تھی۔
”میں نے کہیں منہ کالا نہیں کیا تھا چاند.....“

”جانتی ہوں۔ آپ کھانا کھالیں۔“ بوڑھی چاند بی بی نے پیار سے کہا تھا۔ یہ اسی کے پیار کا اثر تھا کہ بوڑھی آمنہ نے سالوں سے حویلی میں قیام کیا ہوا تھا۔ وہ اب چاند بی بی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ شہر شہر کی خاک چھانٹا اس نے چھوڑ دیا تھا۔

”کالا شخص مزید کیا منہ کالا کرے گا۔“ بوڑھی کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ ”مجھ پر الزام لگایا گیا تھا۔ وہ بچہ بنا جائز نہیں تھا۔“

”جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ آپ کھانا کھالیں۔“ چاند بی بی نے پیار سے کہا تھا۔ بوڑھی آمنہ مسکین صورت لیے کھانا کھانے لگی تھی۔

اجڑ چکی حویلی میں بس دو افراد رہائش پذیر تھے۔ ایک چاند بی بی اور دوسری آمنہ بی بی..... تیسرا تھا سانپ..... جو کسی گھس پیٹھی کی طرح حویلی میں آگھسٹھا اور اب جانے کا نام نہ لے رہا تھا۔ سیاہ کھال پر پجلی چھتروں والا وہ موٹا سانپ زیادہ تر وقت درگا مورتی کے پاؤں سے لپٹا رہتا تھا۔

☆☆☆

چاندی کے بنائے چھوٹے چھوٹے سوئیٹر، موزے اور ٹوپیاں دیکھ کر زویا بہت خوش ہوئی تھی۔

”کیا یہ سب چاندی نے بنایا ہے۔؟“ وہ خوش ہوئی تھی۔ بہت زیادہ خوش۔

”جی۔ یہ سب انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”وہ اس سب میں بہت ماہر ہیں۔ اکثر وہ میرے لیے بھی سوئیٹر وغیرہ بنا دیتی ہیں۔“

”سب بہت پیارا ہے۔ انہیں میری طرف سے شکریہ بولانا۔“ زویا کو سب واقعی ہی میں بہت پسند آیا تھا۔

واحد چاندی جس کو لڑکاس کے دل میں کچھ مٹی سوچ نہیں تھی۔

”شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں..... وہ تو کہہ رہی ہیں کہ جب ولادت کے دن قریب آجائیں گے تو وہ آپ کو کچھ دیسی کھانے بھی بنا دیں گی۔ جو ماں اور بچے کی صحت کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔“

”اڑے..... ان سے کہنا کہ اتنا تکلف مت کریں۔“

”کلف کیسا..... انہیں یہ سب کر کے خوشی ہوگی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کی والدہ نہیں ہیں تو اس لیے آپ کو اس شہر میں اپنی والدہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔“

صندل کی بات پر خوشی یا شکر کی وجہ سے زویا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”تمہاری والدہ واقعی ہی میں بہت اچھی ہیں صندل..... یقین کرو میرا بھی ان کو چاندی کہنے کو ہی دل کرتا ہے۔“

”آپ کہہ لیا کریں۔ انہیں خوشی ہوگی۔“

”کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“ میرزا وہاں آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ اس نے بلیو جینز

بروائٹ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سردی ہونے کے باوجود اس نے کوئی جیکٹ یا سوئیٹر نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کے

عسکرتی بازو اس کی آستینوں سے نمایاں تھے۔ جو اس کے بھرپور جوان ہونے کی چٹلی کھارہے تھے۔ اسے دیکھتے

ہوئے صندل کی آنکھوں کو جیسے قرار کیا تھا۔ وہ کب سے وہاں میرزا کو ہی تو ڈھونڈ رہی تھی۔

”کچھ نہیں..... بس ادھر ادھر کی باتیں.....“ زویا نے جلدی جلدی صندل کی لائی چیزوں کو سینٹا شروع کر

دیا تھا۔ چھوٹے بچے کے سوئیٹر، موزے اور ٹوپیاں دیکھتے ہوئے ایک دم سے ہی اسے شرم کا احساس ہوا تھا۔ جبکہ

وہ خود میرزا کے سامنے ہونے والے بچے کے لیے چیزیں ہتھی رہتی تھی۔

”یہ لو صندوق، یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔“ میر زاد نے اپنی پینٹ کی پاکٹ سے ایک چھوٹا سا خاکہ لٹافہ دکھاتے ہوئے اس کے سامنے رکھا۔
 ”کیا ہے اس میں؟“ صندوق کے بجائے زویا نے تجسس سے پوچھا تھا۔
 ”کھول کر دیکھو صندوق۔“

صندوق نے لٹافہ کھولا تھا۔ اندر سے پازبین نکلی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر صندوق کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔
 ”تم اس دن انہیں تلاش کر رہی تھی ناں۔ مجھے نظر آئیں تو میں نے انہیں تمہارے لیے خرید لیا۔“
 ”بہت شکریہ تمہارا۔۔۔“
 ”تمہیں پسند آئیں؟“
 ”بہت زیادہ۔۔۔“

جواباً میر زاد کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ اور میر زاد کو دیکھتے ہوئے صندوق بھی مسکرا رہی تھی۔ زویا دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”تمہاری پسند اچھی ہے میر۔۔۔“

”میرا سے صرف میں کہتی ہوں صندوق۔۔۔“ زویا نے تنک کر کہا تھا۔ اس کے انداز پر صندوق نے کچھ حیرت سے زویا کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر پہلے والی خوشی غارت ہو چکی تھی۔ اسے میر زاد اور صندوق کا سارا سین بری طرح سے ناپسند آیا تھا۔ صندوق تو چپ ہو کر رہ گئی تھی۔
 ”اور تم تاؤ میر۔۔۔ تم کیا صندوق کے ساتھ بازاروں میں گھومتے رہے ہو؟“ اب کے زویا نے میر زاد سے پوچھا تھا۔ میر زاد لمحے بھر کو گڑ بڑا ہوا تھا۔
 ”وو۔۔۔ اس دن اتفاقاً طور پر ملے تھے ہم۔“
 ”میرے خیال سے تمہیں اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔“
 ”جی۔۔۔۔۔“

”اور صندوق تم۔۔۔۔۔ اپنی والدہ کو میری طرف سے شکریہ کہنا۔۔۔ اور انہیں کہنا کہ مزید کوئی تکلف نہ کریں۔“
 ”جی۔۔۔“ صندوق کہتے ہوئے اٹھی تھی۔ کیونکہ زویا کے سپاٹ انداز نے جیسے اسے اب وہاں سے چلے جانا کا ہی اشارہ دیا تھا۔

صندوق کے وہاں سے جاتے ہی زویا بھی اٹھی تھی۔
 ”میں سوئے جا رہی ہوں۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“
 زویا بھی وہاں سے چلی گئی تھی۔ میر زاد ایسے چپ بیٹھا تھا جیسے زندگی بھر اس نے کوئی لفظ نہ بولا ہو۔

☆☆☆

جب سے افشیں کو چتا چلا تھا کہ اسے دیکھنے لاہور کی کوئی نواب فیملی آنے والی ہے اسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ جبکہ کنزین اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔
 ”یا گل۔۔۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے ان کی لاہور میں۔۔۔ اپنے باغات ہیں۔ لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں اس سب کے لیے۔۔۔ تم نے خود کو بخار چڑھا لیا ہے۔ گولی مارو عادل کو۔۔۔ اور اس رشتے کو قبول کر لو۔“
 سوائے صندوق کے سب ہی نے اسے سمجھا ہوا تھا۔
 ”میں مر جاؤں گی صندوق۔۔۔ میں عادل کے ہاں نہیں رہ سکتی۔“ افشیں نے اس کے آگے دہائی دی تھی۔ دو

تو جیسے بس مر جانے کے قریب تھی۔

”میں سمجھ سکتی ہوں انہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔؟“ وہ بے بس تھی۔

”تم ہی کچھ کر سکتی ہو صندل۔ میں زہر کھالوں گی اگر میری شادی عادل سے نہ ہوئی تو۔۔۔“

”عادل ہے کہاں، وہ گھر کیوں نہیں آ رہا؟“

”وہ اپنی بیارماں کو لے کر شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے میرا۔“

”تم کہو تو تہینہ پھوپھو سے بات کروں۔؟“

”کر سکتی ہو تو کرو۔“

”تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں میری جان۔۔۔ تم فکر مت کرو۔۔۔“

تہینہ پھوپھو آج آنے والے مہمانوں کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ کھانے کا انتظام دیکھ رہی تھیں جب صندل

ان کے پاس پہنچی تھی۔

”آپ سے دو منٹ بات ہو سکتی ہے تہینہ پھوپھو؟“

”ہاں۔۔۔ بولو صندل۔“

”یہاں نہیں، کمرے میں۔“

صندل کے انداز پر تہینہ پھوپھو چونکی تھیں۔ لیکن انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ صندل کے پیچھے

پیچھے وہ کمرے میں آئی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ کیا بات ہے۔“

صندل چند لمحوں کے ساتھ جڑ توڑ کرتی رہی تھیں پھر اس نے مناسب الفاظ میں بتایا تھا کہ انہیں کسی

لڑکے کو پسند کر رہی ہے۔

”کون ہے وہ۔؟“ تہینہ پھوپھو نے ناگوار انداز میں پوچھا تھا۔

”میں نے دیکھا ہوا ہے اسے۔۔۔ پیارا لڑکا ہے۔ گھر ہماری حویلی جتنا تو بڑا تو نہیں ہے۔ لیکن کافی

بڑا ہے۔“

تہینہ پھوپھو کے چہرے پر پھیلی ناگواری جانے کا نام نہ لیتی تھی۔

”اس میں اپنی بیٹی کی خوشی سمجھ لیں تہینہ پھوپھو۔“ صندل نے اتنے پیار سے کہا تھا کہ تہینہ کو نرم ہونا پڑا تھا۔

”یہ بات انہیں کو پہلے بتا دینا چاہیے گی۔“

”اس میں یہ سب بتانے کی ہمت نہیں تھی۔“

”میں بستی کو کیا کہوں گی۔؟“

”مناسب لفظوں میں انکار کر دیجیے گا۔“

”اچھا۔۔۔ دیکھتی ہوں کہ کیا کر سکتی ہوں۔ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم کہہ رہی ہو۔“ تہینہ پھوپھو

پریشان نظر آنے لگی تھیں۔

انہیں کو دیکھنے کے لیے آنے والے مہمان شام میں آئے تھے اور توڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ ساری حویلی کی

لڑکیاں نوابوں کی وہاں آکر کھانے پر جوش تھیں۔ لیکن ان کے ارا مانوں پر پراؤں پڑ گئی تھی۔ وہ بھی شدید سردیوں والی

اوس۔۔۔ نواب صاحب کے گھر سے نہ تو ان کی والدہ آئی تھیں اور نہ ہی کوئی بہن۔۔۔ جو آ یا تھا وہ ان کا خاص ملازم تھا۔

ذہیر دں چھلوں کی ٹوکریوں، زہورات اور کپڑوں کے ساتھ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تہینہ پھوپھو کو نواب صاحب

کی ایک ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر بھی دے گیا تھا۔ جسے دیکھ کر تہینہ پھوپھو کو مایوسی ہوئی تھی۔

تصور میں نواب، انشیں سے کچھ پندرہ، بیس سال بڑا لگ رہا تھا۔ جبکہ حقیقت تہینہ چھو چھو جاتی ہی نہ تھیں کہ یہ تصویر بھی کوئی بیس سال پرانی تھی۔
 ”میں نے تہینہ چھو چھو کسب بتا دیا ہے انشیں..... تم پریشان مت ہو۔ سب اچھا ہوگا۔ تم بس عادل کو خبر کر دو۔ اسے کہو کہ جلدی اپنی ماں کو لے کر خوجلی میں پہنچے۔“

”وہ شہر گیا ہوا ہے۔ بتایا تو ہے۔“
 ”تو کسی طرح رابطہ کر داسے۔“

”میں ایسٹ آباد میں ایک جگہ کو جانتی ہوں صندل۔ کیا تم وہاں جا سکتی۔ وہاں اس کے دوست کی دکان ہے۔ وہاں سے تمہیں عادل کا پتہ مل جائے گا کہ وہ اپنی ماں کو لے کر کس ہسپتال گیا ہے۔ اور کہاں رہ رہا ہے۔“
 ”میں..... شہر سے باہر کیسے جا سکتی ہوں انشیں.....“
 ”کسی بھی طرح کر کے چلی جاؤ صندل.....“ انشیں کی توجہ سے جان پر بنی ہوئی تھی۔

”تم ہی حل بتا دو۔“

”میرزاؤ کے ساتھ چلی جاؤ.....“ انشیں نے حل نکال لیا تھا اور صندل حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
 ”اس کے پاس گاڑی ہے۔ تم صبح جانا اور شام تک واپس آ جانا۔ میں چاندائی سے کوئی کہانہ بتالوں گی۔“
 صندل ابھی بھی آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

”میں تمہاری منت کرتی ہوں صندل..... خدا کے لیے چلی جاؤ..... عادل سے ملو..... اسے میرا حال بتاؤ۔“ انشیں نے کہا تو صندل کو بچانے کیوں اس پر ترس آ گیا۔ یہ محبت بھی کتنی عجیب چیز ہے ناں..... کتنا ذلیل کر دیتی ہے یہ.....
 ”ٹھیک ہے۔ میں کل ہی چلی جاؤں گی۔ لیکن ایک شرط ہے۔ اپنے بخار کو فوراً سے ٹھیک کر لو۔“ صندل نے کہا تو انشیں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

دن شام میں ڈھلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنے کمرے میں موجود بستی صاف عادت ٹیبل پر تاش کے چوں سے تاش گھرنے لگا تھا۔ یہ اس کی مہارت تھی یا شاید قسمت..... اب کی بار گھر ایک دفعہ بھی نہیں گھر آتا تھا۔ وہ یہ گھر بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اس کے بلانے پر تہینہ چھو چھو کمرے میں آئی تھیں۔

”پھر کیا سوچا ہے آپ نے چھو چھو.....“

”مجھے تو اس رشتے سے بہت مانوس ہوئی ہے بستی.....“ تہینہ چھو چھو نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

”کیوں.....؟ کیا ہوا ہے؟“ تاش گھر سے نظریں ہٹا کر بستی نے انہیں گھورا تھا۔

”عجیب بات ہے۔ ان کے گھر سے کوئی آیا ہی نہیں..... نہ ماں نہ بہن.....“

”نواب کی ماں اور باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔“

”کوئی رشتے دار تو ہوگا۔“

”نہیں..... اپنے گھر کے بڑے وہ ہی ہیں۔“

”پھر بھی..... ہمارے گھر انہیں کی رشتے دار کو بھیجنا چاہیے تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ملازم کو بھیج دیا۔“

”یہ بھی تو دیکھیے کہ کتنے اہتمام سے بھیجا ہے۔ کتنا کچھ لایا تھا وہ..... کتنے کپڑے، کتنے پھل اور زیور.....“

جبکہ ابھی رشتہ بھی طے نہیں ہوا ہے۔“

”مانتی ہوں۔ رکھ رکھاؤ نوابوں والا ہی ہے۔ لیکن طریقہ بھی ضروری ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی اعتراض۔“ بستانی نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

”عمر میں وہ انٹیس سے کافی بڑا ہے۔“

”لوگوں کے کیمرے نہیں دولت دیکھی جاتی ہے۔“

”دولت کا کیا کرنا ہے۔ جب زندگی میں خوشی ہی نصیب نہ ہو۔“

تہینہ پھوپھو کی باتیں بستانی کو قصہ دلارہی تھیں۔ وہ اٹھ کر تہینہ پھوپھو کے قریب آیا تھا۔

”آپ کہتے کیا ہیں۔“

”میری طرف سے انکار ہے۔“ تہینہ پھوپھو نے کہہ دیا تھا۔ بستانی کی کن پٹیاں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ

نواب سے دس لاکھ کے عوض انٹیس کی بات کہی کر چکا تھا۔ اور اسے دس لاکھ اب ہر صورت چاہیے تھا۔

”میں اس رشتے کو ہاں بول چکا ہوں۔“ بستانی نے کہا تو تہینہ نے کچھ حیرت اسے دیکھا تھا۔

”تم کیوں انٹیس ہاں بول چکے ہو۔“

”کوئٹہ انٹیس کے لیے مجھے یہ رشتہ ٹھیک لگا ہے۔“

”لیکن مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ میں اپنی بیٹی کی شادی یہاں نہیں کروں گی۔“ تہینہ پھوپھو نے اٹل انداز

میں کہا تھا۔ بستانی نے غصے سے انہیں گھورا تھا۔

”انٹیس کی شادی یہاں ہی ہوگی۔“ اب کے حیران ہونے کی باری تہینہ کی تھی۔ بستانی کا انداز انہیں لمحہ بہ

لمحہ حیران کرتا جا رہا تھا۔ یہ بستانی آج کس انداز میں بات کر رہا تھا۔

”تم شاید بھول رہے ہو کہ انٹیس میری بیٹی ہے۔ تمہاری نہیں..... اس کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ لینے کا حق

میرے مجھے ہے۔“

تہینہ پھوپھو نے کہا تھا اور بستانی کا ضبط جواب دیا گیا تھا۔ اگلے ہی بل اس نے تہینہ پھوپھو کو گلدی سے دبوچ لیا تھا۔

”حق کی بات کرتی ہیں۔ سالوں سے میرے باپ کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ میرے باپ کا دیا ہوا کھارہی

ہیں، یہاں رہی ہیں۔ اور اب آکر حق کی بات یاد آگئی ہے۔“

بستانی چند لمحوں تہینہ کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ پھر جھٹکے سے اس نے تہینہ پھوپھو کو پرے

دھکیلا تھا۔ اپنی گردن سہلاتے ہوئے تہینہ ہکا بکا بستانی کو گھورتی جا رہی تھیں۔ بستانی کے ہاتھوں کی گرفت اتنی

مضبوط رہی تھی کہ ان کی گردن دکھنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ مت کریں انٹیس کی شادی نواب کے ساتھ..... لیکن رات ہونے سے پہلے پہلے اپنی

دونوں بیٹیوں کو لے کر یہاں سے دفع ہو جائیں۔ اس جو بیٹی پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔“

بستانی نے دو ٹوک انداز میں بات ستم کی تھی۔ وہ سب وہی بول رہا تھا جو روشن بیگم نے اسے بولنے کو

کہا تھا۔ روشن بیگم نے واقعی یہی اس کی اچ اچ پر رہنمائی کی تھی۔

”اور جانے سے پہلے پچھلے بیس سالوں کا حساب دے کر جائے گا۔ جو آپ نے اور آپ کی بیٹیوں نے

کھایا، پیایا، پہنا..... اس سب کا حساب..... میں ایک ایک دانے کا حساب لوں گا۔“

تہینہ پھوپھو کو گھورتے ہوئے بستانی کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اور تہینہ پھوپھو اس نئے بستانی کو جاتے

ہوئے دیکھتے جا رہی تھیں۔

حوتی کی چمت پر رحبان اتنے زور سے سکھ بجا رہا تھا جیسے جنگ کی آمد کا بل بجا رہا ہو۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)